مسلم تہذیب و ثقافت کی بقاء: مسلمانوں کی علمی، سیاسی ومعاشی ترقی تحریک آزادی کے تناظر میں

سیدہ شائستہ عشرت*

منزہ حیات**

Abstract

The Muslims endeavoured to survive their civilization, culture and religion in subcontinent at the time of British rule. Because after political dominance, one aim of the British was to disseminate western science, culture, and civilization in subcontinent. Thereafter, a debate among Muslim scholars started that either to accept all this or start a new age with their own culture, sciences and civilization. Therefore, three main school of thought came into exist, one group was in favour of British and had opinion to get western science and collaborate with British for the development of subcontinent. While the second group thought, no need to adopt the western science and they were also against the western culture and civilization. The third school of thought gave a point of view that Muslims should develop their nation and get western knowledge but without demolishing their religious and cultural identity. Practically, the third school of thought remained successful because they had a vision of contemporary and future era. This group was in line with Islamic teachings and

* پی ایچ۔ڈی سکالر، سابقہ پراجیکٹ ریسرچر شعبہ علوم اسلامیہ ،بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

** اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ ،بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

moderate thought had got a success and appreciation from the society.

Keywords: Islamic civilization and culture, modern sciences, Allama Muhmmad Iqbal, Indian independence movement, Educational and Economical devalopment

تلخیص

برصغیر کے مسلمانوں کی ایک صدی کی تہذیبی، ثقافتی، فکری، اور مذہبی تاریخ کا منظر غائر مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مغلوں کے زوال اور انگریزوں کی آمد کے بعد ہی سے مسلمانوں کے زوال کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ جب انگریز آ ئے تو نو آبادیاتی نظام کے ساتھ انہوں نے حکومت وسیاست میں بھی اپنا مقام بنانا شروع کیا۔ اس غلامی کے دور میں مسلمانوں کو تہذیبی، ثقافتی، سماجی و معاشرتی لحاظ سے انتہائی بے دردی سے کچلا گیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ معاشرتی لحاظ سے مسلمان بڑی بڑی جاگیر وں اور حکومتی عہدوں پر بھی فائز تھے۔ مگر جیسے ہی ان سے وہ جاگیریں اورسرکاری عہدے چھین لیے گئے وہ مفلس اور غریب ہو گئے۔ اس مقالے میں مسلم تہذیب کی بقا اور مسلمانوں کی علمی، سیاسی و معاشی ترقی کوتحریک آزادی کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔

قاضی جاوید اپنی کتاب ''سرسید سے اقبال تک''میں کچھ اس طرح رقمطراز ہے۔

> ''آئندہ خطرات کے انسداد کے خیال سے مسلمانوں کو ہر طرح سے تباہ برباد کردیا گیا۔ ہزاروں لوگ جو مختلف حیثیتوں سے سربرآوردہ تھے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔باعزت لوگ بے عزت کئے گئے۔ دولت مند اور خوشحال گھرانے مفلس محتاج بنا دیئے گئے۔ اور جزبہ انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پوری قوم کوظلم وستم کا شکار بنا کر ایسے مصائب میں مبتلا کردیا گیا۔ جن سے نجات پانے کی کوئی صورت نظرنہیں آتی تھی''۱

اس پس منظر کی عکاسی ڈاکٹر کنیز فاطمہ اپنی کتاب میں کرتی ہیں اور کچھ اس طرح لکھتی ہیں کہ

> ''انگریز اس وقت ۱۵۰ سال سے ہندوستان میں ایک طاقتور حیثیت سے موجود تھا۔ مسلمانوں کو معاشی، سماجی، تہذیبی، ہر سطح پر مجروح کیاگیا۔ مسلمان تعلیم اور اپنے دور کے

تقاضوں سے بے بہرہ تھے۔ معاشی نظام بدل چکا تھا۔ ان کو نہ تو نوکری ملتی تھی نہ وہ کسی اور طریقے سے روزی کما سکتے تھے۔ مذہبی رجحانات اس قسم کے تھے کہ مغربی تعلیم حاصل کرنا کفر تصور کیا جاتا تھا۔ ایک شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ آبا وَ اجداد کی روایات سے منضبط تھے۔اور ہر طرح کی بدحالی کے باوجود اپنے موروثی فکر وعمل میں تبدیلی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ------ اس وقت یہ بارآور کرایا گیا کہ سفید آدمی ترقی یافتہ اور مہذب ہے۔ یہ اس کی فراخ دلی ہے کہ اس نے رنگدار قوموں کو تہذیب اور علم وفنون کی خوبیوں سے شناسا کروانے کے لیے ان کی تعلیم ،صحت، اور ترقی کا بوجھ اپنے ذمے لے لیا ہے۔ جب رنگدار لوگ تعلیم حاصل کرلیں گے تو سفید لوگ اپنے ملک چلے جائیں گے۔ ---مغربی تعلیم سے مستفید ہونا تہذیب و ترقی کی پہلی سیڑھی بن گیا ''۲

اس لحاظ سے تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی قوم پر کوئی دوسری قوم فاتح بن کر غالب آتی ہے تو وہ سب سے زیادہ ان کی معاشرت ،تہذیب وثقافت مذہب، زبان اور روایات کو متاثر کرتی ہے۔ اور مغلوب قوم غلامی کی وجہ سے غالب اورفاتح قوم کی طرز معاشرت کو اپنانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس اصول معاشرت و تہذیب کا ذکر ابن خلدون '' مقدمہ ابن خلدون''میں کرتے ہیں۔

'' انسان فاتح قوم کے کمالات کا اعتماد رکھتا ہے۔ اور مفتوح قوم نہ صرف جسمانی غلامی قبول کرتی ہے۔ بلکہ ان کے ذہن بھی غلام بن جاتے ہیں کیونکہ مفتوح کی نگاہ میں فاتح کی عظمت سما جاتی ہے۔ یا وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے کہ کہ فاتح قوم میں کوئی غضب کا کمال ہے جس کی وجہ سے حکومت کا مالک بن بیٹھا ہے۔ -----اس لیے تم دیکھو گے کہ مفتوح ،فاتح کے ہر فعل کی نقل کرتا ہے۔ کھانے پینے میں، پہننے اوڑھنے میں، رہنے سہنے میں، سواریاں رکھنے میں، اسلحہ کی شکل وصورت میں بلکہ اس کی ہر ادا میں مشابہت قبول کر لیتا ہے۔''۳

ابن خلدون کے اصول کی عکس بندی انگریز کے دور میں مسلمانوں کے دور زوال میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسا کہ ابن خلدون نے بیان کی ہے۔ اس لحاظ سے برصغیر کے لوگوں میں بھی انگریزی طرز معاشرت رواج پاتی جا رہی تھی۔اور ترقی پسند لوگ علمی، معاشی ترقی کے لیے انگریزی علم وفن بہت تیزی سے اپنا رہے تھے۔یہ بات ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی معاشرے کی ثقافت بدل دی جائے تو کوئی بعید نہیں کہ جس

معاشرت اور تہذیب کو اپنایا گیاہے اس کو اس قوم کی علم وفنون کے ساتھ ساتھ ان کی اقدارکو بھی اپنا لیا جائے۔ اور اس قوم کی سیاسی اور حکومتی پالیسی کو بھی من وعن تسلیم کرلیا جائے۔ طارق جان اپنی کتاب'' سیکولرازم مباحث اور مغالطے''میں لکھتے ہیں۔ ''میں اس سوچ میں حق بجانب ہوں کہ اگر آپ کسی قوم کے سماجی نظام کے ثقافتی عنصر کو تبدیل کر دیں تو انجام کار آپ اس کی خارجہ پالیسی کو بھی بدل سکتے ہیں''۔۴

یہ بات واضح ہے غالب قوم بہر حال مفتوح قوم کی ثقافت وتہذیب ،تمدن، مذہب، علم وفن، فکرو فلسفہ، معاشرت ومعیشت ان تمام پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ اور مفتوح قوم اس طرح فاتح قوم کی معاشرت کو اپنا لیتی ہے۔ اور اس کے رنگ ڈھنگ اپنا لیتی ہے۔ اور اپنا تشخص کھودیتی ہے۔ اور فاتح قوم میں ضم ہو جاتی ہے۔ اور کوئی علیحدہ سے قوم نہیں رہتی۔

اسی طرح ایک اورمقام پر طارق جان اپنی کتاب ''سیکولرازم مباحث اور مغالطے'' میں لکھتے ہیں ''انسانی زندگی مصائب کا شکار ہو جاتی ہے بلکہ نری جہنم بن جاتی ہے جب دو ادوار، دو ادیان اور دو ثقافتیں ایک دوسرے پر چھانے اور اسے ڈھانپنے کی کوشش کرتی ہیں''۵

انگریز دور کی اوج کمال کی ترقی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک نہایت حیرت انگیز شے تھی۔ مگر دن بدن برطانوی حکومت اسے ہندوستان میں پھیلا رہی تھی۔ اور مسلمان انگریز حکومت سے اختلاف رکھنے کے باوجود اسے اپنا رہے تھے۔ عسکری، علمی، سائنسی ٹیکنالوجی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور مسلمانوں کا ان جدید علوم سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے روزگار میں مشکلات تھیں۔ جبکہ قدیم فنون اور علوم کا استعمال بہر حال کم ہوتا جا رہا تھا۔

اس موضوع کا ذکر ڈاکٹر فاطمہ یوسف اپنی کتاب ''اقبال اور عصری مسائل'' میں کرتی ہیں۔

> ''کمپنی کے دور اور برطانوی حکومت کی دوصدیاں متعدد تہذیبوں میں تصادم کی صدیا ں تھیں۔ برطانوی جدیدیت نے برصغیر پاک و ہند میں پرانی تہذیبوں کو اتنا بڑا چیلنج پیش کیا تھا کہ وہ ایک حد تک لڑکھڑا گئی تھیں۔ مسلم تہذیب کے لیے یہ تصادم بڑے گہرے

اثرات کا حامل تھا۔ مغربی تہذیب ہر لحاظ سے طاقت کا مظہر تھی۔ عسکری اور سائنسی ایجادات پر مبنی قوت تو مسلمانوں کی سمجھ میں آتی تھی۔ کیونکہ یہ حواس خمسہ کی حدود میں تھی۔ انگریز کی فوج بڑی مستعد اور ہر طرح کے جنگی ہتھیاروں سے لیس تھی۔ انہوں نے تار برقی، ریل، گاڑی، بحری جہاز،سڑکیں ،نہریں اورانتظامیہ کے دفاتر تعمیر کیے گئے''۶

مغربی تہذیب میں شامل تمام ترمغربی سائنسی ایجادات علم وفنون اور ان کے نظریات شامل تھے جو ان کی قومیں اپنے ملکوں میں اپنا کر ترقی کی راہوں پر گامزن تھیں۔ اب یہ معلوم کرناضروری ہے کہ مشرقی تہذیب دراصل کن بنیادوں پر قائم تھی اور کس طرح یہ مشرقی تہذیب غالب مغربی تہذیب سے متاثر ہو رہی تھی۔

مسلم تہذیب وثقافت کی تعریف واہمیت

مسلم تہذیب و ثقافت کا اگر جائزہ لیا جائے یہ بات بہت ہی عجیب محسوس ہو گی کہ مسلم تہذیب پوری دنیا میں یکساں نہیں ہے خاص طور پر تہذیب کے وہ مظاہر جو پوری دنیا کی تہذیبوں کے مظاہرمیں یکساں نظر آتے ہیں۔ وہ اسلامی تہذیب میں یکساں نہیں ہیں۔ پوری دنیا میں مسلمان، لباس، رہن سہن، تمدن کے لحاظ سے آپس میں مختلف نظر آتے ہیں۔ مگر پھر بھی کچھ ایسی بنیادی چیزیں ہیں کہ جن کی بنیاد پر اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اور وہ پوری دنیا میں ہمیں یکساں نظرآتے ہیں۔ ایک عام تہذیب کی تعریف کے بارے میں کنیز فاطمہ اپنی کتاب ''اقبال اور عصری مسائل'' میں ''تہذیبی قدروں کا زوال'' کے موضوع کے تحت لکھتی ہیں ''جب کوئی ثقافت علم وہنر، نظم وضبط، فہم وتخلیق،دولت وحشمت کے ارتقاء کے باعث ایک خاص تمدنی مقام حاصل کرلیتی ہے۔ تو تہذیب کہلاتی ہے۔''۷

تہذیب کی یہ تعریف دنیا کے تمام تہذیبوں پر صادق آتی ہے۔ اور اسی تعریف کے تحت دنیا کی مختلف تہذیبیں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں اورایک شناخت رکھتی ہیں۔ جبکہ اسلامی ثقافت کی تعریف تہذیب کی اس عام تعریف سے قدرے مختلف ہے۔ اور اس کی بنیاد میں یہ سب چیزیں نہیں بلکہ ان کی بنیاد دراصل کسی اور نظریہ پر ہے۔ اسلام کے پیش نظر یہ سب چیزیں بھی ضروری ہیں مگراسلام اپنے نظریے کے تحت ان تمام شعبہ زندگی کو اہمیت دیتا ہے۔

اس بارے میں مولانا مودودی ''اسلامی تہذیب وتمدن'' میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ''لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کی تہذیب کا نام ہے اس کے علوم وآداب، فنون لطیفہ، صنائع وبدائع، اطوارو معاشرت، اندازتمدن اورطرزسیاست کا مگر حقیقت میں یہ نفس تہذیب نہیں ہے نتائج ومظاہر ہیں تہذیب کی اصل نہیں ''۸ اسی طرح ''اسلامی تہذیب وتمدن''میں ایک اور مقام پر مولانا مودودی لکھتے ہیں۔ ''تہذیب جس چیز کا نام ہے اس کی تعمیر ان تکوینی پانچ عناصر سے ہوتی ہے۔ (۱) دنیوی زندگی کا تصور (۲) زندگی کا نصب العین (۳) اساسی عقائد و افکار (۴) تربیت افراد (۵) نظام اجتماعی۔''۹

مسلمانوں کی تہذیب کا تعلق مذہب کے ساتھ بہت گہرا ہے۔ اور اس کی تہذیب پر دوسرے تمام اثرات سے زیادہ مذہب کا اثر ہے۔ اس کی بنیادوں میں اسلام کے عقائد وافکار ہیں۔ اس لحاظ سے مسلم تہذیب کے ڈھانچے اور اسلامی تمدن کی عمارت پر مذہب کا رنگ نمایاں ہے۔

اس کے بارے میں ابوالحسن ندوی اپنی کتاب ''اسلامی تہذیب و ثقافت'' میں لکھتے ہیں۔ ''انبیاء نے صرف عقیدہ شریعت اور ایک نئے دین ''اسلام''ہی کی دعوت نہیں دی بلکہ وہ تہذیب و تمدن اور نئے طرز حیات کے بانی ہوتے ہیں۔ جو''ربانی تہذیب'' کہلانے کی مستحق ہوتی ہے۔ اس تہذیب کے کچھ مخصوص اصول و ارکان اور شعائر و علامات ہیں۔ جن کے ذریعے وہ دوسری تہذیبوں اور جاہلی تمدن سے نمایاں اور ممتاز ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کی تہذیب کا پہلا عنصر دینی عقائد۔اسلامی اصول زندگی، اور اخلاقیات ہے۔۔۔مسلمان دنیا کے کسی ملک، کسی گوشے میں بستے ہوں اور ان کی زبان ان کا لباس خواہ کچھ بھی ہو۔یہ قدر مشترک ان میں ضرور پائی جاتی ہے اور اس کی بناء پر وہ ایک خاندان کے افراد اور ہر جگہ ایک ہی تہذیب کے حامل نظر آتے ہیں۔ اسی مشترک عنصر کے لحاظ سے دنیا کے سارے مسلمان ایک مخصوص تہذیب رکھتے ہیں۔''۱۰

دراصل اسلام کے نظریے کی بنیاد توحید، سنت رسول، اور قرآن کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔ اور اگر کہیں کوئی حکم قرآن میں موجود نہ ہو تو اس کے لیے انسانی عقل

استعمال کی جائے گی۔ اور جو بھی اصول یا قانون بنایا جائے گا وہ قرآن وسنت سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ عقل اور زمانے کے بھی موافق ہو۔

اسی طرح کنیز فاطمہ اپنی کتاب ''اقبال اور عصری مسائل'' میں ایک مقام پر لکھتی ہیں۔ ''مسلم تہذیب ایک ایسے نظام کا نام ہے جس نے خدا اور کائنات کے ساتھ انسان کے رابطوں کے اصول بیان کیے جو فکروعمل کے تمام طریقوں کا احاطہ کرتے ہیں اور یہ اصول جامد نہیں، متحرک ہیں۔ ان اصولوں کا منبع قرآن، رسول ﷺ کی ذات اور عوام کی قوت تخلیق ہے۔''۱۱

اس لحاظ سے مسلم تہذیب کی بنیاد توحید، کتاب اللہ، سنت رسول ،اجماع، قیاس اور اجتہاد ہے۔ اور یہ اصول زریں صرف مسلم ثقافت کا ہی خاصہ تھا۔ کسی اور تہذیب کی خصوصیات نہیں تھیں۔ جس کی وجہ سے مسلم تہذیب دوسری تمام تہذیبوں سے مختلف نظر آتی ہے۔ اور اس تہذیب کے بنیادی اصول وقت اورزمانہ کے سہ بختیوں کی نظر نہ ہوسکی جیسا کہ ہمیں دوسری بہت سی تہذیبیں وقت کی تیرہ بختیوں کی نذر ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مسلم مفکرین کے نزدیک دنیا میں تمام ثقافتوں کو دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جس کا ذکر معید الظفر اپنی کتاب'' تہذیبی تصادم اور فکر اقبال'' میں کرتے ہیں۔

> ''ا: اسلامی ثقافت ۲: جاہلی ثقافت۔ اسلامی ثقافت ایک ایسی ثقافت ہے جو اسلام کے نظریہ حیات پر قائم ہے۔ جبکہ جاہلی ثقافت کی اساس وبنیاد ان کے نزدیک فکر انسانی کو مرجع صحت و عدم قرار دیتا ہے جس سے یہ انسانی فکر الہٰ بن جاتی ہے۔ اور ایسی ثقافت اللہ کی ھدایت سے محروم رہ جاتی ہے۔''۱۲

برصغیر کی ثقافت پر خصوصیت سے بات کرنے سے پہلے اس کی تاریخ اور ماضی کے حالات پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ برصغیر میں علم کی حکومتی سطح پر کبھی سرپرستی نہیں ہوئی۔ اور فلسفہ، تاریخ، سائنس، ٹیکنالوجی، شعروادب کے کوئی خاص ادارے قائم نہیں ہوئے تھے۔ کبھی کبھی علم کی کوئی شمع کہیں کسی دور میں نظر آتی ہے۔ اور زیادہ تر علم دینی درسگاہوں کی صورت میں تھا۔ جن میں سائنس اور جدید علوم کی بجائے صرف قرآن،

حدیث، فقہ، منطق وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یا پھر صوفیا کی خانقاہیں جہاں سے دینی اور روحانی تعلیم وتبلیغ دی جاتی تھی۔

برصغیر میں جب برطانوی دور آیا تو انگریز نے معاشرتی، سیاسی، علمی، عسکری، معاشی لحاظ سے اپنا اثر یہاں کی ثقافت پر ڈالنا شروع کیا۔ تو یہاں پر بھی علم کی تقسیم ہو گئی اور علم دوحصوں میں بٹ گیا۔ فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، قانون، سیاست، انتظامیہ، عسکری، تربیت کے مراکز انگریز کے پاس چلے گئے۔ جبکہ عربی، فارسی، علم قرآن، علم حدیث، علم فقہ مسلمان معلم کے پاس رہ گئے۔ اس لحاظ سے سائنسی علوم، اقتصادیات اور معاشیات کا جو علم انگریز اپنے ساتھ لائے تھے اس کو سیکولر سمجھا گیا۔ اور اس کو اسلامی تعلیم کے خلاف سمجھا گیا۔ اس لیے کہ یہ وہ علوم تھے جن کا برصغیر کے مدارس میں کو ئی تصور نہ تھا۔ انگریزی کے خلاف تو باقاعدہ جہاد کیا گیا۔

اس لحاظ سے مسلم تہذیب و ثقافت اپنے عقائد و افکار کی وجہ سے دوسری تہذیبوں سے منفرد تھی خصوصی طور پر مغربی تہذیب سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ جب مغربی تہذیب نے برصغیر کے مسلمانوں کی ترقی و خوش حالی پر اثرات مرتب کیے تو مسلم اہل فکر ودانش کو اس کی اس قدر فکر نہ ہوئی۔ مگر جب مغربی تہذیب نے مسلمانوں کی فکر اور اندازفکر کو متاثر کیا۔ اور ان افکار کی بنیاد پر بننے والی تہذیب کو متاثر کیا جس کا تعلق دین سے تھا تو اہل علم ودانش نے مسلم تہذیب کوبچاتے ہوئے مسلمانوں کی ترقی و خوشحالی اور روزگار کے لیے فکری انداز میں جدوجہد شروع کی۔ اس فریضہ کی سرانجام دہی میں مفکرین تین گروہوں میں تقسیم ہوگئے۔ ان تین گروہوں کا مقصد اسلامی تہذیب وثقافت کو بچاتے ہوئے مسلمانوں کو زوال اور پستی سے نکال کر ترقی و خوشحالی کی طرف گامزن کرنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک گروہ نے ایک خاص نقطہ نظر اختیار کیا۔ اور اس کا فکری اور عملی طور پر مظاہرہ کیا۔

ان تین سماجی و سیاسی مفکرین کے مکاتب فکر درج ذیل ہیں۔

۱: ان میں سے پہلے گروہ کا موقف یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی پستی اور زوال کی وجہ ان کی جہالت ہے۔ اور ان کے خیال میں تعلیم، تعلیم اورصرف تعلیم ہی ان کی

اس خراب حالت کو درست کرنے کا علاج ہے۔ اور اوراس تعلیم سے مراد مغربی تعلیم ہوتی ہے۔ اور ان کے مطابق مغربی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلش کاسیکھنا ضروری ہے۔ اور یہ کہ مسلمانوں کی ترقی صرف اور صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ وہ جدید مغربی علوم حاصل کریں اور ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو جائیں۔ اور ان مغربی علوم سے استفادہ کے لیے ایک نئے علم الکلام کے اشد ضرورت ہے جو ان مغربی علوم سے بحث کر سکے اور ان میں سے جو موافق نظریات ہوں ان کو اپنی تعلیمات میں شامل کر لیا جائے اور جو مخالف ہوں ان کی تردید کردی جائے۔ اسلامی نظریات کی تشکیل جدید یا تشکیل نو کی جائے۔ اور یہاں تک کہ مغربی طور اطوار سیکھ کر اپنے آپ کو ان مغر بی ا قوام جو کہ مہذب تعلیم یافتہ اورترقی یافتہ قوموں کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کریں۔ اور دنیا میں اپنے آپ کو ترقی پزیر اقوام سے نکال کر ترقی یافتہ اقوم میں شامل کرنے کی جدوجہد کریں۔ برصغیر میں اس مکتبہ فکر کے رہنماء سرسید احمد خان ہیں۔ اور ان کے بعد سید امیر علی اور مولوی چراغ علی بھی ان کے ہم خیال ہیں۔ اپنے نقطہ نظر کی تکمیل کے لیے انہوں نے ایک ادارہ '' علی گڑھ'' کے نام سے قائم کیا۔ اور اپنے افکار کا پرچار کیا۔

۲: دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اپنے روایتی علوم کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ اور اس گروہ کے ارباب فکرونظر نے مغربی نو آبادیاتی نظام کی مخالفت تمام جدید علوم وفنون کی نفی کی۔ اس کی وجہ محض رجعت پسندی اور قدامت پسندی نہیں تھی بلکہ ان کے خیال میں جدید علوم صرف جدید علوم نہیں ہیں بلکہ ان جدید علوم کو قبول کرنا دراصل استعمار کو قبول کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے غیر ملکی علوم جدیدہ کی نفی دراصل غیرملکی حکمرانوں کی برتری رد کرنے کے مترادف تھی۔ اس مکتبہ فکر کے راہنماء شیخ الہند محمودالحسن ہیں۔ اور ان کی سربراہی میں ''دارالعلوم دیوبند'' فعال رہا۔

یہ ادارہ دینی اور روایتی علوم کے لیے بے حد مقبول اور اور سیاسی لحاظ سے انتہائی سرگرم رہا۔ یہ مکتبہ فکر قرون وسطی کی مذہبی فکر سے آگے نہ بڑھ سکے اور وہ اس عقیدے پر

سختی سے قائم رہے کہ اجتہاد کا دروازہ اب بند ہوچکا ہے۔ اور اس صور ت میں اسلامی تصورات یا الہیات کی تشکیل نوکا تو خیر کوئی جواز ہی موجود نہیں۔ اس مکتبہ فکر نے مشرقی علوم، روایتی علوم، دینی علوم،اسلامی تہذیب وثقافت سب کو تو محفوظ کر لیا لیکن برصغیر کے مسلمانوں کی ترقی اور معاشی خوشحالی کے لیے کوئی لائحہ عمل پیش نہ کرسکا۔

۳: تیسرے گروہ کے خیال میں مسلمانوں کو مغربی جدید علوم سے مکمل طور پر استفادہ کرنا چاہیئے۔ اور ان جدید علوم کے حصول میں اجتہاد کا دروازہ درپیش مسائل کے حل کے لیے ہمیشہ کھلا ہونا چاہیئے۔ اوراسلامی الہیات کی تشکیل جدید بھی لازمی جز ہے جدید علم الکلام سے بحث بھی ہو۔ مگر یہ سب اسلامی تہذیب وتمدن کو محفوظ رکھتے ہوئے یعنی اپنی شناخت اور اپنی خودی کو برقرار رکھتے ہوئے برصغیر کے مسلمانوں کی معاشی ترقی اور خوشحالی کے لیے کام کیا جائے۔ مسلمانوں کو اپنا تشخص برقرار رکھنا چاہیئے ۔اس مکتبہ فکر کے سرخیل علامہ محمد اقبال ہیں۔ اور پھر کچھ پہلوؤں سے اختلاف رکھنے کے باوجود مولانا شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی بھی ان کے ہم خیال ہیں۔

اس دور میں جب مغربی ممالک علم ودانش کے لیے یونیورسٹیاں قائم کر رہے تھے اس وقت ہمارے ہاں مساجد و مقبروں اور مدارس کی تعمیرات کا کام جاری تھا۔ جوکہ مسلم ثقافت کی علامت تھے۔ درس نظامی کی طرز پر بننے والے ان مدارس کو قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کی صحیح تعبیر و تشریح سے ہی مسلمان ترقی کریں گے۔ مگر یہ تعبیر کیسے ہو گی؟ کیا ہوگی؟کون کرے گا ؟ اور اس پر عمل درآمد کا کیا طریقہ ہو گا ؟ یہ سب کچھ ندارد تھا۔ کیوں کہ صرف یہی مدارس ہی علمی مراکز تھے جہاں سے مسلمانوں کی معاشی و اقتصادی، معاشرتی سماجی اور سائنسی ترقی کی امید تھی۔ مگر ان مراکز میں دنیاوی امور کہ جس کے ذریعے غربت اور جہالت سے نکلتے ،ترقی اور خوشحالی کر کے دوسرے ملکوں کے برابر آتے یا باہر سے آنے والے خطرات کا مقابلہ کرتے۔ اس کے لیے کوئی ان اداروں میں خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔

سرسید احمد خان کی مسلمانوں کی ترقی کے لیے جدوجہد:

اس دور میں جب انگریزی حکومت اپنی تمام ترقی اور ٹیکنالوجی کے ساتھ برصغیر میں حکومت کر رہی تھی اور اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کی مکمل کوشش کر رہی تھی اس وقت میں اسے سب سے زیادہ خطرہ مسلمانوں سے تھا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ مسلمان اپنا کھویا ہوا اقتدار ضرور حاصل کریں گے اور اپنی تہذیب وثقافت کی بقا کی جنگ ضرور لڑیں گے۔ اس لیے انگریزی سرکار کی طرف نوکری کے مواقع کم میسر آنے کی وجہ سے مسلمانوں کی معاشی حالت انتہائی مخدوش تھی۔

ان حالات میں سرسید احمد خان ایک طرف تو مسلمانوں کی حالت دیکھتے کہ معاشی لحاظ سے انتہائی کمزوراوردوسری طرف انگریزوں کی ترقی اور ٹیکنالوجی اور ان کی جدید تہذیب وتمدن ہے جس سے عوام متاثرہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ انگریزوں کی زبان سیکھنے جدیدعلوم اور ان کی جدید تہذیب وتمدن اپنانے کی تلقین کرتے۔ انگریزوں سے غداری کو مذہبی لحاظ سے بھی درست نہیں سمجھتے تھے۔ اور انگریزوں کو اہل کتاب کے دائرہ کار میں رکھتے ہوئے ان سے میل جول، لین دین، کھاناپینا سب جائزقراردیتے تھے۔اور مسلمانوں سے یہ کہتے تھے کہ ان کی پستی کی وجہ ان کی اپنی جہالت ہے۔ جدید علوم حاصل کیے بغیر مسلمان زندگی کے میدان میں آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔

قاضی جاوید صاحب اپنی کتاب ''سرسید سے اقبال تک'' میں سر سید احمد خان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ایک جلسے میں آپ نے فرمایا کہ''اس زمانے میں یہ چیز دیکھنے کے قابل ہے کہ کون سی چیز اب ہمارے ملک کے لیے مفید ہے ؟کون سے علوم ہم کو مہذب بنا دیں گے؟اور کس زبان کا سیکھنا ہماری شائستگی کو ثابت کرے گا ؟اور دنیا میں ہمیں آبکار بنا دے گا۔ میں اس بات کے کہنے پر مجبور ہوں کہ وہ انگلش لٹریچر اور سائنس ہے۔۔ ۔۔۔۔اب بہت سے ایسے علوم ایجاد ہوچکے ہیں کہ جن کو ہمارے باپ دادا نہ جانتے تھے۔ وہ اس زمانے کے لیے مفید اور کارآمد ہیں۔ اگر ہم پرانی لکیر کو پیٹتے رہے تو گویا ہم

موجودہ زمانے سے سینکڑوں برس پیچھے ہٹتے ہیں۔ حالانکہ ہم کو آگے بڑھنا چاہیے۔"[۱۳]

اس لحاظ سے سر سید احمد خان انگریز حکومت کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا چاہتے تھے۔ اور اس طرح ان کو اس کے علاوہ اور کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کیونکہ انگریز حکومت اس وقت ہندوستان میں اپنی سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے ترقی کے جھنڈے گاڑ رہی تھی۔ اور ہندوستا ن کی عوام کو سہولیات فراہم کر رہی تھی۔ اس لیے سر سید احمد خان نے صرف انگریز وں حکومت کے ساتھ مفاہمت میں ہی مسلمانوں کی خیرخواہی دیکھ رہے تھے۔بلکہ وہ انگریز حکومت کے ساتھ وفاداری کے اصول کو اپنانے کی تلقین کرتے تھے۔تاکہ مسلمان بھی حکومت کے ساتھ تعاون کی فضا میں ترقی کی طرف گامزن ہو سکیں۔

قاضی جاوید اپنی کتاب "سرسید سے اقبال تک"میں اس صورت حال کا ذکر کرتے ہیں۔ " میری رائے یہی رہی کہ ہماری گورنمنٹ اور ہندوستان کی رعایا میں ایسی محبت اور یگانگت ہوجائے کہ ہر ایک کو امور مذہبی اور رسوم ورواج سے کچھ سروکار نہ رہے، مگر تمام رعایا اور ہماری گورنمنٹ انتظامِ ملکی میں ایک رائے ایک قصہ اور ایک ارادہ رہیں اور تمام ہندوستاں کی رعایا گورنمنٹ انگلشیہ کو اپنا بادشاہ سمجھ کر اس کی خیر خواہی اور رفاقت میں رہے۔۔۔۔۔جن مسلمانوں نے ہماری سرکار کی نمک حرامی اور بدخواہی کی ہے میں ان کا طرف دار نہیں ہوں۔میں ان سے بہت ناراض ہوں ہنگامہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کواپنے مذہب کی بموجب عیسائیوں کے ساتھ رہنا تھا جو اہل کتاب اور ہمارے مذہبی بھائی بند ہیں۔ نبیوں پر ایمان لائے۔ خدا کے دیئے ہوئے احکام اور خدا کی دی ہوئی کتاب اپنے پاس رکھتے ہیں جس کا تصدیق کرنا اور ایمان لانا عین ہمارا ایمان ہے۔"[۱۴]

اس پس منظر میں وہ انگریز حکومت کے ساتھ پاسداری کو مذہب اسلام کا حصہ سمجھتے تھے اور اس کے ساتھ غداری کو مذہب اسلام کے حکم کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور ان کو اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے کے خواہاں تھے۔ اور ان کی انگریزی تہذیب کے طور اطوار سیکھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ سرسید احمد خان ہندوستانی

قوم کو انگریزوں کے مقابلے میں بہت ہی پست قوم سمجھتے تھے اور ان کی ترقی اور خوشحالی اور انکی تہذیب کی بقا صرف اسی بات میں محسوس کرتے تھے کہ وہ انگریزوں کی تہذیب کو اپنائیں ان کی ترقی اور ٹیکنالوجی کو استعمال کرکے دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں اپنے آپ کو شامل کریں۔

اس کے بارے میں قاضی جاوید ''اپنی کتاب'' سرسید سے اقبال تک ''میں لکھتے ہیں۔

> ''میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے ادنیٰ تک، امیر سے غریب تک، سوداگر سے لے کر اہل حرفہ تک، عالم ،فاضل سے لے کرجاہل تک، انگریزوں کی تعلیم وتربیت اور شائستگی کے مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسے لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے وحشی جانور کو۔ ۔۔فرض کرو ہندوستانی اور انگریز ایک آزاد ملک میں جا بساوے جائیں اور بالفعل جو عادتیں اور طرز زندگی اور پرائیویٹ لائف ہندوستانیوں کی ہے۔ وہ ایسی ہی رہے۔ اور جو انگریزوں کی ہے وہ ہو بہو ویسی ہی رہے تو ہرگز انگریز ہندوستانیوں کے پاس بھی کھڑے نہ ہوں۔ اور جانور سے زیادہ نہ سمجھیں۔''[۱۵]

سرسید احمد خان ہندوستانی عوام کو انگریزوں کے مقابلے میں ایک غیر مہذب قوم سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اسی بات کو عوام کے مفاد میں سمجھا کہ وہ اپنے آپ کو مہذب قوموں میں شامل کرنے کے لیے نہ صرف انگریزوں کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے علم سے استفادہ کریں بلکہ ان کی تہذیب کو بھی اپنائیں۔ معاشی خوشحالی میں اپنا نام پیدا کریں اور غربت اور جہالت سے چھٹکارا حاصل کریں۔ مزید برآں مذہبی تحقیق کی تفصیلات میں سرسید احمد خان کا یہ محرک تھا کہ ہندوستان میں مسلم غریب اور پسے ہوئے طبقے کا ایک نظریہ مرتب کیا جائے کہ جس میں مسلمانوں کی نئی نسل کو مغربی تہذیب کے آئینے میں اسلام کی سچائی کا یقین دلایا جائے اس کے لیے انہیں اسلام کی ایک نئی توجیہ پیش کرنا پڑی۔ جس میں انہوں نے مغربی فلسفے کو خوش آمدید کہا اور اسے اسلامی فلسفے کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی۔ اور یہ موقف اختیار کیا۔ مغربی تہذیب وثقافت کے بنیادی یونانی فلسفے سے استفادہ کیا جائے۔

اس موقف کی وضاحت کے لیے قاضی جاوید ''سرسید سے اقبال تک'' میں لکھتے ہیں۔

''اس بابت میں ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ برصغیر میں جدید مغربی علوم وفنون اور تہذیب و ثقافت کے اثرات کی آمد سے درحقیقت وہی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جو قرون وسطیٰ میں اسلامی تہذیب اور یونانی فلسفے کے ملاپ کے وقت پیدا ہو گئی تھی۔ لہٰذا اہل دانش وفکر کا فرض ہے کہ وہ حکمائے قدیم کی طرح نئے علوم وفنون کی روشنی میں اسلامی الٰہیات کی تشکیل نو کریں۔ ۔۔ یہی باعث ہوا کہ بہت سے مسائل یونانی فلسفے اور علم طبعی کے، جو تیسری قسم کے تھے، مسلمانوں نے اپنی مذہبی کتابوں میں شامل کر لیے۔ اور رفتہ رفتہ مذہبی مسائل کے تسلیم ہونے لگے، حالانکہ ان کو مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔''[۱۶]

دراصل جس پہلو کی جانب سر سید احمد خان توجہ دلارہے ہیں یہ مسلمانوں کا دور عروج تھا۔ جس میں مسلمان کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا نہیں تھے۔ بلکہ وہ ایک انتہائی پر اعتماد قوم کی طرح یونانی فلسفیانہ موشگافیوں کو اسلام کی حقانیت سے لغو قرار دیتے تھے۔ جبکہ زوال کے دور میں اسلامی تعلیمات کو سائنس اور فلسفہ کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طریقہ کار میں مسلمان پراعتماد نظر نہیں آتے بلکہ وہ ایک معذرت خواہانہ اور دفاعی نقطہ نظر میں نظر آتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آج اسلام کو اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لیے سائنس کی ضرورت ہے۔

مغربی تہذیب کے علوم پر مغربی دانشوروں نے کچھ اس طرح اپنے ذہنیت کی تہہ چڑھائی کہ مسلم دانشور اور حکمران طبقہ صرف اور صرف مغربی تہذیب اور مغربی جدیدیت کو ہی اپنی تمام تر خوشحالی کے لیے مسیحا سمجھنے لگا۔ اس نے نہ صرف عام ذہنیت کے مسلمانوں کو مغرب سے مرعوب کیا بلکہ اسلامی دنیا کے جلیل قدر عالم، مبلغ، مصلح، مفکر بھی اس دھوکے کا شکار ہوئے۔ مگر بہرحال ہندوستان میں ان جدید مغربی علوم اورنظریات کی وجہ سے حقیقتاً ایک جدید علم الکلام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس موضوع پر سرسید احمد خان نے خصوصی توجہ دی۔ سر سید احمد خان نے اسلامی اصولوں، عقیدوں اور قدروں کی اس انداز میں تاویل کرنے کی کوشش کی کہ وہ مغربی تہذیب سے ہم آہنگ نظر آئیں دارالعلوم دیوبند کی مسلم ثقافت کی بقا میں اہم کردار ادا کیا۔

دارالعلوم دیوبند چونکہ ایک دینی اور علمی ادارہ تھا اس لیے اس ادارے سے منسلک

علماء کرام نے مسلمانوں کے ثقافتی ،تاریخی ،دینی ورثے کو محفوظ بنانے کے لیے ایک خاص نصاب کو ترتیب دیا جس میں انھوں قرآن، حدیث، فقہ، منطق، سیرت، اور عربی ادب پرمشتمل مضامین کو شامل کیا گیا۔ اور تمام جدید اور مغربی علوم سے احتراز کیا۔ مسلمانوں کو مغربی علوم حاصل کرنے سے روکا گیا۔ اور مشرقی علوم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی۔ جوکہ دینی علوم پر مشتمل تھے۔ اس کے لیے بہت سے مدارس بھی تعمیر کیے گئے۔

قاضی جاوید اپنی کتاب''سرسید سے اقبال تک'' میں لکھتے ہیں۔''برصغیر میں علماء ہمیشہ سے غیر منظم رہے۔ اسی بنا ء پر ہندی مسلمانوں کی مذہبی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی زندگی میں ان کا کردار کمزور رہا ہے۔۔ ۔اول ذکر [دارالعلوم دیوبند]تحریک سے وابستہ لوگ اپنی تاریخی ،قومی، و ملی، روایات کو برقرار رکھنے کی خاطر نو آبادیاتی حکمرانوں سے عدم مطابقت پذیری کو ذریعہ نجات تصور کرتے تھے۔ جب کہ دوسرا گروہ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ مطابقت پذیری کو فلاح کی راہ سمجھتا تھا۔۔ ۔۔۔جدید علوم محض جدید علوم نہیں تھے اور نہ ہی انیسویں صدی کے ہندوستان میں انہیں قبول کرنا نو آبادیاتی صورت حال کو قبول کرنے پر بھی دلالت کرتا تھا۔ لہذا علوم جدیدہ کی نفی درحقیقیت غیر ملکی حکمرانوں کی برتری ذہنی طور پر مسترد کرنے کے مترادف تھی''۔۱۷

یعنی کہ دارلعلوم دیوبند کے علماء بھی دو اقسام میں منقسم ہو گئے ایک طبقہ مغربی علوم سے احتراز کرنے کی تلقین کرتا۔ اور انگریزی تہذیب و ثقافت سے الگ رہنے اور مشرقی علوم وتہذیب کو اپنانے کی نصیحت کرتا۔ مگر ان دارلعلوم دیوبند کے علماء کرام میں سے ایک طبقہ مغربی علوم و ترقی اور یلغار کے اثرات دیکھ کر ان سے بچنے کو محال سمجھتے ہوئے ان علوم سے استفادہ کو ضروری خیال کرتے تھے۔ جن میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور عبید اللہ سندھی نمایاں شخصیات ہیں۔

ان علماء کرام میں سے ایک مشہور شخصیت مولانا شبلی نعمانی جن کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے تھا۔ انہوں نے سر سید احمد خان کی علمی نظریات سے بھی استفادہ کیا۔ مگر ان سے بہت سے نظریات پر اختلاف بھی کیا۔ اس لحاظ سے مولانا شبلی نعمانی مغربی تہذیب و

تمدن کے دلدادہ ہونے کے باوجود اسے اسلام کے حوالے سے پرکھنے کا رجحان رکھتے تھے۔ اور وہ کسی بھی جدید معیار کے مطابق اسلام کی اصلاح اور تشکیل نو کی بجائے راسخ الاعتقادیت کے خواہش مند تھے۔ مولانا شبلی انگریزی سے وفاداری کے ساتھ ساتھ مکمل طور پر اسے قبول کرنے سے کتراتے تھے۔ مولانا شبلی نے اس بات کی بے حد کوشش کی کہ دارالعلوم دیوبند کی قدامت پرستی اورعلی گڑھ کی جدت پسندی کے درمیان کوئی رستہ تلاش کیا جائے۔ مگروقت اور تجربے کے ساتھ ساتھ یہ بات درست ثابت نہ ہوسکی۔ اس مقصدکے لیے انہوں نے ندوۃ العلماء کے ادارے سے منسلک ہو کر اپنے مقصد کو پایا تکمیل تک پہنچانے کے لیے مصروف عمل ہو گئے۔

اس پس منظر کے بارے میں قاضی جاوید اپنی کتاب ''سرسید سے اقبال تک'' میں لکھتے ہیں کہ ''وہ اسے حقیقی معنوں میں ایسی درس گاہ اور عوامی تحریک کی صورت دینا چاہتے تھے۔ جو ہندی مسلمانوں کو اپنی تہذیب و تمدن کے ساتھ وابستگی قائم رکھتے ہوئے عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالنے کی تربیت دے دیوبند علماء نے اپنے گردوپیش چاردیواری تعمیر کر رکھی تھی۔سیاسی طور پر ترقی پسند ہونے کے باوجود سماجی، تہذیبی،اور علمی معاملات میں وہ رجعت پسندی کا شکار تھے۔'' ۱۸

اسی طرح ایک اور مقام پر صاحب کتاب'' سرسید سے اقبال تک ''میں مولانا شبلی نعمانی کا موقف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''اس میں ذرہ بھر شبہ نہیں کہ اگر ہم کو یقین ہو کہ مشرقی تعلیم کی کسی بھی تجویز سے مغربی تعلیم میں ذرہ بھر بھی کمی ہوگی تو ہمارا فرض ہے اس تجویز سے اعلانیہ نفرت کا اظہار کر دیں۔ کیونکہ ہماری ترقی کا انحصار جدید علوم پر ہے۔ اسے نظر انداز کرنے سے ہندی مسلمان دیگر ہمسایہ قوموں سے زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے اور ان کی ''ملکی اور قومی زندگی دفعتا برباد ہو جائے گی''۔ ۱۹

اس لحاظ سے مولانا شبلی کے مطابق ترقی یہ ہے کہ روایت کو جدید ڈھانچے میں ڈھالا جائے ہماری تہذیب ہمارا ورثہ ہے ہم کسی صورت اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہاں مگر جدید علوم سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے دونوں کو ساتھ لے کر چلنا بہت

ضروری ہے۔ اس لحاظ سے وہ مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کوبھی شامل نصاب کرنے کی بات کرتے تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی بھی دیوبندی مکتبہ فکر سے متاثر اور ان کے نمائندہ تھے۔ مگر سماجی اور معاشرتی لحاظ سے ان کا نقطہ نظر دیوبندی مکتبہ فکر سے مختلف تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کو محفوظ کرتے ہوئے انھیں ترقی اور خوشحالی میں آگے بڑھانے کے لیے اشتراکی اصولوں کو اپنانے پر اصرار کرتے رہے۔ آپ پر اشتراکیت کے بہت اثرات تھے مگر آپ اشتراکیت کے فلسفے سے اس قدر گہرائی سے واقف نہیں تھے۔ اس لیے اس کے بارے میں آپ کا رویہ اور فکر رومانوی اور غیر سائنسی تھا۔ مذہب اور اشتراکیت کو ایک ہی مانتے تھے۔مگر اشتراکیت روحانیت سے خالی ہے۔ اس لیے اس کومکمل مذہب نہیں مانتے تھے۔ اور ان کے مطابق اگر اشتراکیت میں مذہب کی کمی ہے تو اسلام کو اگر ساتھ لے کر چلا جائے تو اس میں سے اس کمی کو بھی دور کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی کہ اشتراکیت کو کمی بیشی کیے بغیر کسی ملک یا کسی خطے میں اس کو نافذ العمل بنایا نہیں جا سکتا۔

ان میں ایک اہم نقطہ یہ ہے۔ جو انہوں نے اپنے صدارتی خطبے میں پیش کیا کہ''میں سفارش کرتا ہوں کہ نیشنل کانگریس کے کرتا دھرتا یورپین نیشنلزم کو رواج دینا اپنا نصب العین بنا ئیں۔ وہ فقط اقتصادی ترقی کو اپنی آزادی کی بنیاد قراردیں''[۲۰]

اس دور میں دارالعلوم دیوبندسے فارغ التحصیل اور اساتذہ بھی ان جدید نظریات سے متاثر ہوئے بنا ءنہیں رہ سکے۔ اور انہوں نے بھی اپنی اپنی ذہنی وسعت اور تجربے کی بناء پر مسلمانوں کو اپنا تاریخی ورثہ بچاتے ہوئے مسلمانوں کی خوشحالی کے لیے ان کو اپنے نظریات سے آگاہ کیا تاکہ وہ انہیں اپنے کردار سے دنیا میں اپنا ایک مقام بنائیں۔

علامہ اقبال کا مسلم ثقافت کی بقاء کے لیے حصول آزادی کا نظریہ :

علامہ محمد اقبال نے یورپ کے قیام کے دوران مغربی ممالک کی تہذیب کا انتہائی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اور ان کے علوم و فنون اور اس سے حاصل ہونے والی ترقی اور

خوشحالی کا بنظرعمیق مشاہدہ کیا۔ اور یہ معلوم کیا کہ اس تہذیب کی ترقی کا راز آخر کس چیز میں مضمر ہے ؟ اور یہ بھی کہ مسلم اقوام کس طرح اپنے آپ کو ترقی کے دھارے میں شامل کر سکتی ہیں کہ جہاں ان کا تشخص، تاریخ، ثقافت اور ان کے عقائد بھی محفوظ رہ سکیں۔ اسی بناء پر انہوں نے شکستہ دل اور بے سہارہ ایک بہترین قیادت سے محروم مسلمانوں کے لیے نظمیں لکھیں۔ جس میں انہوں نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ ان کی خودی کی تعمیر کی اہمیت کو بیان کیا۔ جو ان کے تشخص کو برقرار رکھنے میں مضمر تھی۔ انہوں نے مسلم قوم کو مذہب اسلام کے نام پر متحد ہونے کی تلقین کی۔

انہوں نے مسلمانوں کو ان کی خامیوں اور کمزوریوں سے آگاہ کیا۔ اور ان پر قابو پانے کی تلقین کی۔ مغربی علوم حاصل کرنے کی تلقین کی تاکہ وہ بھی دوسرے ممالک کی طرح خوشحال ہو جائیں۔ اور ان کا زندگی کے ہر شعبہ میں مقابلہ کر سکیں۔ اور دنیا میں کسی بھی جگہ مسلمان مغربی ممالک کی ترقی سے مرعوب ہو کر اپنا تشخص نہ کھو بیٹھیں۔

ڈاکٹر کنیز فاطمہ ''اقبال اور عصری مسائل'' لکھتی ہیں کہ

> '' [علامہ] اقبال اپنے وقت کا واحد مدبّر تھا۔ جس نے تہذیبی مخاصمت کو پہچانااور یقین رکھتا تھا کہ یہ دور اسلامی تہذیب کے وسیع تر دائرہ بنانے کا دور بھی ہے۔ بشرطیکہ مسلمان تہذیبی ارتقا ء کی تین بنیادی تقاضوں کی اہمیت کو پہچان سکے۔ [اوّل] ہنر مندی [دوم] زماں ومکاں کی قوتوں کا ادراک اور [سوئم] اجتہاد کی اہمیت۔ بدقسمتی سے آج مسلمان ان تینوں تقاضوں سے دور نظر آتا ہے'' ۲۱

جیسا کہ ہم دنیا میں دیکھ سکتے ہیں کہ مختلف تہذیبوں کے درمیاں ایک کشمکش جاری ہے۔ اور اس جہاں میں وہی تہذیب زندہ رہے گی۔ یا غالب رہے گی جومعاشرے کے بنیادی آفاقی اصولوں کو اپنائے گی۔ ہاں مگر دنیا کے بدلتے ہوئے تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے معاشرے کی نئی طرز پر تعمیر بھی بہت ضروری ہے۔

اقبال کی اسلامی تہذیب و ثقافت کے ارتقاء کے لیے دعوت

اقبال نے مسلمانوں کی اس طرف توجہ مبذول کروائی کہ وہ دنیا میں ہونے والے

انقلابات کو دیکھیں۔ ان سے تحریک لیں اور اپنے ذہنی اور فکری جمود کو توڑیں۔ اور ترقی اور خوشحالی سے اپنی تہذیب و ثقافت کو ایک جدید رنگ دیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس بات کی بھی ترغیب دلائی کہ اشتراکی انقلاب سے تحریک لے کراپنے ہاں معاشی نظام کو بہتر بنائیں۔ واضح رہے کہ علامہ اقبال نے اس میں اشتراکی نظام کی خامیوں کو بھی پیش نظر رکھنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

علامہ اقبال اپنی ایک نظم ''اشتراکیت'' (ضرب کلیم) میں لکھتے ہیں:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمئی رفتار
اندیشہ ہوا شوخی افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

علامہ اقبال نے اپنے پیغام سے اپنی قوم میں ایک جان پیدا کر دی انہوں نے اسے یہ پیغام دیا کہ خدائے بزرگ وبرتر نے ''انسان'' میں بے انتہاء خوبیاں اورقوتیں پنہاں کر رکھی ہیں۔ یہ تما م تر قوتیں وہ اپنے لیے اور عوام کی بہبود کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اور اجتماعی طور پر ترقی کا باعث بن سکتا ہے۔ اس طرح سے وہ دوسری ترقی یافتہ قوموں میں اپنا ایک مقام بنا سکتا ہے۔ اور اپنی ایک باوقار شناخت بنا سکتا ہے جس کا نام انہوں نے'' خودی'' رکھا ہے۔ علامہ اقبال یہ جان چکے تھے مسلمان اسلامی ثقافت کے محرکات کو بھول چکا ہے۔ اسے اپنے جوہر کی پہچان نہیں رہی۔ انہوں نے اسی نظریہ خودی کے ذریعے سے انسان کو اس دنیا میں اپنا مقام بنانے کے لیے تلقین کی۔

اقبال نظریہ خودی سے متعلق اپنی ایک نظم ''جاوید کے نام''(بال جبریل)میں لکھتے ہیں

خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ
خودی سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ

پھر اسی طرح ایک اور مقام پر اپنی ایک نظم ''نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا''(ارمغان حجاز)میں لکھتے ہیں۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح وشام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
خودی سے مرد خود آگاہ جمال وجلا ل
کہ یہ کتاب باقی تمام تفسیریں

علامہ اقبال اپنی ایک اورنظم ''یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادصبح گاہی''[بال جبریل] میں لکھتے ہیں

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادصبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
جو رہی تو خودشناسی، نہ رہی تو روسیاہی

علامہ صاحب اپنی ایک نظم ''اعجاز ہے کسی کا یا گردش زمانہ''(بال جبریل)میں لکھتے ہیں۔

غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی
شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ

اسی طرح ایک اور مقام پر اپنی ایک نظم ''دین وتعلیم'' (ضرب کلیم)میں لکھتے ہیں۔

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

ایک اور مقام پر ایک نظم ''دین وہنر'' (ضرب کلیم) میں لکھتے ہیں

ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب دین و ادب ہوئے بیگانہ

ان اشعار میں علامہ اقبال نے '' نظریہ خودی''پر بات کی ہے۔ اور امت مسلمہ کو ''اپنی خودی'' کی تعمیر پر زور دینے کی بات کی ہے کہ جس سے وہ دنیا میں اپنی شناخت قائم کرسکیں گے۔ اور بین الاقوامی دنیا میں اپنی شناخت بقول علامہ اقبال خودی قائم رکھنے کے لیے اسے علم وتحقیق کے میدان میں اپنا مقام بنانے کی اشد ضرورت ہے۔

علامہ اقبال نے مسلمانوں کی معاشی واقتصادی حالت زار دیکھ کر ایک کتاب '' علم

الاقتصاد' کے نام سے انہوں نے لکھی۔ جو کہ معاشی لحاظ سے بے حد مفید تھی۔ اس میں انہوں معاشی مسائل پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اور کئی قسم کی معاشی اصلاحات کرنے کی سفارش پیش کی ہے۔ مسلم کاشتکاروں کی پسماندگی دیکھ کر آپ بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہو گئے اور اپنی نظم ''فرشتوں کا گیت''(بال جبریل) میں لکھا کہ

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

اردو دائرہ معارف الاسلامیہ کے مطابق اقبال تہذیب وتمدن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ'' اقبال تہذیب اور تمدن افرنگ پر شدت سے تنقید کرتے ہیں۔ وہ یورپ کی محدود عقلیت اور مادیت سے بیزار ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی یورپ کی طرح علوم وفنون میں ترقی کریں لیکن مادی تمدن میں روحانی اندازتفکر و تاثیر کی آمیزش سے اسے کامل انسانیت کا آئینہ دار بنائیں''۔**۲۲**

اصلاح تمدن کے لیے بھی علامہ اقبال نے اپنی کوششیں جاری رکھی۔ قاضی جاوید'' سرسید سے اقبال تک میں'' لکھتے ہیں کہ'' اصلاح تمدن فی الواقعہ ایک مذہبی مسئلہ ہے کیونکہ اسلامی تمدن اصل میں مذہب اسلام کی عملی صورت کا نام ہے۔ اس اصلاح کے لیے ہندی مسلمانوں کو ایک نئے علم الکلام کی ضرورت ہے۔ جس کے ذریعے وہ اپنے عقائد کو عہد حاضر کے علمی وفکری نظریات سے ہم آہنگ کر سکیں۔ مزید براں فقہ کی تشکیل نو بھی ضروری ہے۔''**۲۳**

اصلاح تمدن میں علامہ اقبال نے جن موضوعات کو زیر بحث رکھا گیا ان میں اسلامی الہیات کی تشکیل جدید، سیاسی اصلاحات ،حقوق نسواں، پردہ، تعدد ازدواج اور تعلیم وغیرہ کو انہوں نے اپنے شعری اور نثری ادب میں موضوع سخن بنایا ہے۔ آپ خواتین کو ہر طرح کی تعلیم کی آزادی دینے کے قائل تھے۔ ہاں مگر پردے کے آپ قائل تھے اور اس کے خلاف نہ تھے۔ تعدد ازدواج کے بارے میں بھی آپ نے اسے ہندوستان کے ماحول کے لیے نامناسب قرار دیا۔ تعلیم وتربیت پر بھی آپ نے اپنی شاعری کے ذریعے تعلیم کی اہمیت

اجاگر کی۔ بلا ضرورت ایک سے زیادہ شادی کے قائل نہیں تھے۔ خاص طور پر ہندوستان کی آبادی اور اقتصادی مسائل کے پس منظر میں ان کو یہ درست معلوم نہ ہوتا تھا۔

علامہ اقبال اپنی ایک نظم ''لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی'' میں لکھتے ہیں۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدنظر
وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ

(بانگ درا)

اسی طرح ایک اور نظم ''عورت کی حفاظت'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ

نے پردہ ،نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

اور تعلیم کے حوالے علامہ اقبال اپنی نظم ''سید کی لوح تربت''(بانگ درا)میں لکھتے ہیں۔

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں
ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا

علامہ اقبال اپنی ایک نظم میں ''تعلیم اور اس کے نتائج''(بانگ درا)میں لکھتے ہیں۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

ایک نظم ''مسلمان اورتعلیم جدید'' [بانگ درا] میں علامہ صاحب لکھتے ہیں۔

اس دور میں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا
ہے خون فاسد کے لیے تعلیم مثل نیشتر

ایک اورنظم ''دین وتعلیم''(ضرب کلیم)میں علامہ صاحب لکھتے ہیں۔

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین ومروت کے خلاف

علامہ اقبال نے اسلامی تہذیب سے متعلق اپنی کتاب ''تشکیل جدید الہیات'' میں لکھتے ہیں '' مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اس تہذیب کی ظاہری آب وتاب کہیں اس تحریک میں خارج نہ ہو جائے اور ہم اس کے حقیقی جوہر،ضمیراور باطن تک پہنچنے سے قاصر رہیں''۲۴

اور علامہ اقبال مسلمانوں کی تمدن وتہذیب کی اصلاح کے لیے ان تمام موضوعات کو زیر بحث لائے جن کا درج بالا ذکر کیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''علم الاقتصاد'' میں مسلمانوں کے معاشی مسائل اور ان سے جنم لینے والے تمدن کے بگاڑ پر بھی جامع گفتگو کی ہے۔ اور ان مسائل کے حل کے لیے ایک پُر مغز بحث کی ہے۔

علامہ اقبال اپنی کتاب '' علم الاقتصادٗ' میں لکھتے ہیں کہ ''موجودہ محققین اقتصاد کا سب سے بڑا فرض اس بات کا علم حاصل کرنا ہے کہ دولت کے استعمال کے وہ کون کون سے طریق ہیں جن سے تمدن کا شیرازہ بکھرتا ہوتا ہے۔ افراد قوم کی اخلاقی اور جسمانی حالت ترقی کرتی ہے۔ اور بحثیت مجموعی ملک کی اور اقتصادی نظام کے تمام اجزا ہم آہنگ ہو کر قوم کی بہبود ی کا باعث ہوتے ہیں۔ علی ہذا القیاس یہ دریافت کرنا بھی ضروری ہے کہ صرف دولت کی کون کون سی صورتیں تمدنی اور اخلاقی لحاظ سے انسان کی فطرت پر برا اثر کرتی ہیں''۔۲۵

"The Reconstructions of Religious Thought in Islam"میں علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ

> The new culture find the foundation of world -unity in the principle of Tauheed. Islam as a polity, is only a paractical means of making this principle a living factor in the intellectual and emotional life of mankind.۲۶

علامہ اقبال کے اس موقف کے بارے میں فتح محمد ملک اپنی کتاب ''اقبال کے سیاسی تصورات میں لکھتے ہیں کہ

''اوپر کی سطروں میں اقبال نے اسلام کے تصور توحید سے پھوٹنے والے کلچر کی نشاندہی کی

ہے وہ وحدت انسانی کا علمبردار ہے ان کے خیال میں اسلامی سیاست اس تصور توحید کو انسانی معاشرے میں‌ایک زندہ حقیقت کا روپ بخش سکتی ہے۔ ۔۔۔اسی طرح اقبال نے اپنے عظیم شاہکار میں مشرق و مغرب کی عصری زندگی میں انقلابی کشمکش کو بھی تہذیبی مکالمے کی صورت بخشی ہے۔ اشتراکیت اور ملوکیت کی کشمکش، سرمایہ و محنت کی باہمی پیکار، دنیا ئے اسلام کا اضطراب مسلسل اور ایسے کتنے ہی ایسے موضوعات ہیں کہ جنہیں اقبال نے تہذیبوں کے درمیان مکالمے کی صورت میں زندہ جاوید کر دیا ہے۔۔۔۔اپنی تہذیبی شخصیت کے اندر گفتگو بازار گرم کرنا ہے تب کہیں جا کر ہم اپنے سالم ملی وجودکے ساتھ دوسری تہذیبوں سے کوئی معنی خیز ثقافتی لین دین کرنے کے قابل ہوسکیں گے''۔[۲۸]

معید الظفر کے مطابق اقبال ان مفکرین میں سے ہیں جن کا مشرقی اور مغربی دونوں تہذیبوں پر عالمانہ تجزیہ ہے۔ اور مغرب کی علمی اور سائنسی کاوشوں کو سراہتے ہوئے ان کی تہذیب پرایک ناقدانہ نظر بھی ڈالی ہے جو کہ انتہائی غیرجانبداری کی علامت ہے۔ معید الظفر اپنی کتاب '' تہذیبی تصادم اور فکر اقبال'' میں لکھتے ہیں کہ ''اقبال نہ کسی سلطنت کے دباؤ میں آئے اور نہ جامد مذہبی تصورجو صرف رسوم تک محدود ہوتا ہے۔ کے حامی رہے اور نہ ہی نئی تہذیب یعنی مغربی تہذیب کے مخلص مقلد اورپیروکار ثابت ہوئے اس لیے کہنا بے جا نا ہوگا کہ اقبال نہ قدامت اور جدت کے علمبردار تھے بلکہ وہ صرف اس کی تبلیغ کرتے تھے جس کو وہ حق سمجھتے تھے۔**۲۹**

علامہ اقبال فرد کو تہذیبوں کی ترقی کا ذمہ دار سمجھتے ہیں اور فرد کو اجتماعی طور پر محنت کے ذریعے اپنی تہذیب کو پروان چڑھانے کی ذمہ داری پر بات کرتے ہیں اور ملت کے ہر فرد کی انفرادی اہمیت کوبرقرار رکھتے ہوئے اس کو اجتماعی طو رپر اپنی ملت وقوم کے لیے ایسے اقدامات کرے کہ جس سے اس کی تہذیب باقی تہذیبو ں میں اپنی شناخت قائم کر سکے۔

علامہ اقبال اپنی ایک نظم ''بڑھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو'[ارمغان حجاز]میں لکھتے ہیں

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اسی طرح معید الظفر ایک اور مقام پر'' تہذیبی تصادم اور فکر اقبال'' میں ہی اقبال کا موقف لکھتے ہیں '' علامہ اقبال اسلامی تہذیب سے متعلق نظریاتی طور پر آفاقی سمجھتے ہیں وہ اسلام کو علاقوں اور ملکوں سے بالا کہتے ہیں اور اسلامی تہذیب کو بین الاقومی تہذیب کہتے ہیں وہ مسلمانوں کو وطن سے منسوب کرنے کی بجائے اسلام سے نسبت رکھنے پر تیار کرتے ہیں''۳۰

اور اس کی وضاحت کے بیان میں لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال مغرب کی صورت حال کو دیکھ کر اس میں فساد اور بگڑتی ہوئی صورت حال بیان کرتے ہیں کہ جس تہذیب میں اخلاق کی صورت حال اس قدر ابتر ہو وہ تہذیب قطعاً آفاقی یا بین الاقوامی تہذیب نہیں بن سکتی۔ اقبال ان عناصر کی نشان دہی کرتے ہیں جس کی وجہ سے مشرقی تہذیب اپنی شناخت کھو دے گی۔ اس لیے وہ مشرقی تہذیب کو ان تمام عناصر سے پاک رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ علامہ اقبال اپنی نظم ''مغربی تہذیب'' [ضرب کلیم]میں لکھتے ہیں

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب

کہ روح اس میں مدنیت کی رہ نہ سکی عفیف

اس لحاظ سے اقبال نہ صرف مغربی تہذیب کی ترقی سے تحریک لینے کی بات کرتے ہیں وہیں پر اس تہذیب کی خامیوں پر بھی گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح ایک غیر جانبدار محقق کی طرح مغربی تہذیب کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

اسلامی تہذیب کی آماجگاہ پاکستان کا قیام

علامہ اقبال اسلامی تہذیب کے تحفظ کے لیے ایک ایسا علاقہ چاہتے تھے جہاں مسلمان اپنی اسلامی تہذیب کے تحفظ کو یقینی بنائیں۔ اور مشرقی علوم سیکھنے کے ساتھ ساتھ مغربی علوم بھی حاصل کریں۔ لیکن اسلامی تہذیب کو نقصان نہ پہنچے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے پاکستان کے حصول کے لیے کوششیں تیز کر دیں۔

ڈاکٹر ایوب صابر اپنی کتاب '' تصور پاکستان ''میں علامہ اقبال کے موقف کی

وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ'' تمام قوتوں کو ایک آفاقی تہذیب کے تحت لانے کے لیے ضروری ہے کہ حقیقی اسلامی معاشرے کی تشکیل ہواور اسے دنیا کے سامنے بطور نمونہ پیش کیا جائے۔ اسلامی معاشرے کی تشکیل کسی ایسی سر زمین پر ممکن ہو جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو قیام پاکستان ایک اہم پیش رفت تھی۔۳۱

علامہ اقبال کا اسلامی تہذیب اور پاکستان کے درمیان ایک گہرے تعلق کو فتح محمد ملک نے اپنی کتاب ''اقبال فراموشی'' میں ذکر کرتے ہیں۔

''اقبال نے برصغیر میں اسلام کے وجود کو خطرات سے بچانے کی تمنا میں جداگانہ مسلمان مملکتوں کے قیام کا تصور پیش کیا تھا۔ ہماری سیاسی اور تہذیبی جدوجہد کی اس اہم ترین دستاویز میں اقبال نے پاکستان کے قیام کے امکان کو اسلامیان ہندکے ساتھ ساتھ خود اسلام کے حق میں بھی ایک نیک فال قرار دیا۔ اقبال نے فرمایا تھا کہ پاکستان کے قیام سے اسلام کو فائدہ پہنچے گا۔ ۔۔۔یوں اسلام کے کلچر ،قانون اور تعلیم کو اسلام کی حقیقی روح کے مطابق حرکت دی جائے گی۔۳۲

وحید قریشی اپنی کتاب ''علامہ اقبال کا تصور ریاست '' میں اقبال کا موقف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ''۱۹۳۰ میں ان کے ہاں یہ احساس شدت اختیار کر گیا کہ برصغیر کے سیاسی حالات کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمانوں کے جن خطوں میں عددی اکثریت حاصل ہے وہاں انہیں آزاد کر دیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے مذہبی اصولوں کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ الگ ملک کا یہ مطالبہ محض اقتصادی اغراض یا دوسرے مادی فوائد کے لیے نہ تھا بلکہ اپنے کلچر، اور اپنی روایات ومذہب کی حفاظت کے لیے تھا۔۳۳

اسی گفتگو کو لے کر آگے چلتے ہوئے ایک مسلم مفکر سید قطب شہید اپنی کتاب ''جادہ منزل'' میں لکھتے ہیں۔''جب کسی معاشرے میں حاکمیت صرف اللہ کے لیے مخصوص ہو، اور اس کا عملی ثبوت یہ ہو کہ اللہ کی شریعت کو معاشرے میں بالاتری حاصل ہو تو صرف ایسے معاشرے میں انسان اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے کامل اور حقیقی آزادی حاصل کرسکتے ہیں۔ اسی کامل حقیقی آزادی کا نام ''انسانی تہذیب'' ہے''۳۴

اسلامی کلچر کے بارے میں مصدق محمود گھمن اپنی کتاب '' امت اور ریاست'' میں لکھتے ہیں کہ'' اسلامی کلچر یا ایک مسلمان کے زندگی گزارنے کا طریقہ وہ ہے جو قرآن و سنت نے بیان کر دیا ہے۔ یہ ایک ضابطہ حیات ہے جس پر نبی آخر الزماںﷺ نے ایک معاشرہ تشکیل دیا اور انسانیت جہالت کے اندھیروں سے روشنی کی طرف آگئی۔ اسلامی ثقافت، اخلاقیا ت ا ور سادگی کے اصولوں پر کھڑی ہے''۔**۳۵**

اس لحاظ سے ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کا تحفظ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اپنے دین اسلام کی حفاظت اہم ہے۔ اس لیے کہ دین کے ستون کھڑے کرنے کے لیے جگہ اسلامی تہذیب میں ہی ہو گی۔ اور شعائر اسلام دراصل اسلامی تہذیب میں ہی نظرآتے ہیں۔ اور دین اسلام پوری آب وتاب کے ساتھ اسلامی تہذیب میں نمایاں نظر آسکتا ہے۔

اسلامی تہذیب کی مغرب میں موجودہ صورتحال

جہاں پرمشرقی اسلامی ممالک میں مغربی اقدار کا اسلامی تہذیب پرگہر ااثر ہوا وہیں پر مغربی ممالک میں بھی اسلامی تہذیب مغربی اقدار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

اس کے بارے میںمرزا محمد الیاس اپنی کتاب ''جمہوریت اور اسلام'' میں لکھتے ہیں۔

> '' مغرب دانشوروں کے خیال میں اسلام ایک تہذیبی قوت کے طور پر شکست کھا چکا ہے۔ وہ جدید معاشی زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس تہذیبی و معاشی شکست نے اس کی سیاسی شکست کا رستہ کھولا۔ اس کی جگہ مغرب نے لے لی اور اب شکست خوردہ ماضی واپس لانے اور اسلام کے غلبے کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے تشدد کا استعمال کر رہے ہیں۔۔۔۔ مغرب کا اصرار ہے کہ : یورپ اور امریکا آنے والے مسلمان اپنی تہذیب ،کلچر اورروایات برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اور وہ اپنی دینی اور ایمانی قربت کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں''۔**۳۶**

مغرب میں بھی مسلمانوں نے اسلام اور اسلامی تہذیب کو قائم کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ چونکہ دین اسلام کی جڑیں اسلامی تہذیب میں پیوست ہیں۔ اس لیے

مسلمانوں کو اسلامی تہذیب کی حفاظت اور بقاء بہت عزیز ہے۔ اور ان کی یہ جدوجہد ہر دور میں اور ہر جگہ جہاں کہیں مسلمان آباد ہیں ،جاری رہی ہے، اور جاری رہے گی۔

اسلامی تہذیب اور برصغیر کے مسلمانوں کا معاشی مستقبل

اسلامی تہذیب کا ایک اہم رکن ان کی اسلامی معیشت ہے جو کسی بھی دوسری تہذیب یا کسی اور سیاسی نظام کے تحت متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی معیشت کے لیے بھی اہم وہی اصول وقواعد ہیں جو اسلام نے مقرر کیے ہیں۔ مسلمان اسی معیشت کے ذریعے اپنی تہذیب کے خدوخال مکمل کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے علاقے میں اگر اسلامی معیشت نہ ہو تو اسلامی تہذیب نامکمل نظر آتی ہے۔

مولانا مودودی اپنی کتاب '' تحریک آزادی ہند اور مسلمان '' میں اپنا موقف اس طرح بیان کرتے ہیں کہ '' مسلمانو ں کو قوم پرستی اور پھر بین الاقوامی اشتراکیت کے نظام میں جذب کرنا آسان نہیں، سب سے پہلے اسلامی قومیت کا تخیل اس راہ میں حائل ہے، جس کی وجہ سے مسلمان، غیر مسلموں کے ساتھ ایک قومیت بنانے اور اس میں جذب ہوجانے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔ پھر اسلامی تہذیب کے ساتھ مسلمانوں کی شیفتگی ایک دوسری رکاوٹ ہے کیونکہ مسلمان اپنی تہذیب کو تمام تہذیبوں سے بہتر سمجھتے ہیں، اور اس کو کسی دوسری تہذیب سے بدل لینے پر آسانی سے راضی نہیں ہو سکتے ''۔**۳۷**

اس تمام صورت حال میں مسلمانوں نے مغربی معاشی نظام کو اپنانے میں تردد کیا اور نہ صرف مسلم مفکرین ان معاشی نظاموں پر اختلافی نقطہ نظر کے ساتھ سامنے آئے۔ بلکہ عام مسلمان بھی اسلامی معاشی نظام کے مقابل میں ان مغربی معاشی نظام کو نہ اپنا سکے۔ مگر اسلامی معاشی نظام میں معاشی اور سیاسی مسلم مفکر زمانے کے لحاظ سے اور بین الاقوامی سطح پر بدلتی ہوئی صورت حال کے مطابق کو ئی خاطر خواہ اصلاحات نہ کر سکے۔ جس کی وجہ سے بین الاقوامی معاشی نظاموں کے مقابلے میں اسلامی معاشی نظام بھی مسلمانوں کے لیے اس قدر فعال اور مؤثر ثابت نہ ہو سکا۔ جس قدر اسے ہونا چاہیے تھا۔

نتیجہ بحث

اس تمام بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ایک مغلوب تہذیب جو کہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کی وجہ سے زوال پذیر ہوئی ہے اس کو اپنی خامیوں کو دور کرنے کے لیے سب سے پہلے تو اپنی شناخت اور خودی کو بیدار کرنا ہو گا۔ اسلامی تہذیب کے اصول تو ویسے بھی آفاقی ہیں اور ان اصولوں کو فراموش کرنے سے ہی وہ تہذیب زوال پذیر ہو سکتی ہے۔ اور ان اصولوں کو زندہ کرنے سے وہ پھر عروج وکمال کو پہنچ سکتی ہے۔ یہ بات حقیقت ہے کہ کسی دوسری تہذیب کے مفروضات قبول کرنے سے اس کے تضادات جنم تو لیں گے۔ لیکن کیا ان جدید تہذیبوں کا مطالعہ ہی نہ کیا جائے۔ کہ انہوں نے کس طرح ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ اور یہ بات حقیقت ہے کہ دنیا کی کوئی تہذیب اپنے اندر پوری دنیا کا علم سمیٹے ہوئے نہیں ہے بلکہ علم کا عمل تو جاری وساری ہے۔ جو تمام تہذیبیں اپنے اپنے طور پر حاصل کرتی ہیں۔ اور ایک دوسرے سے مستفید ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی غالب تہذیب، مغلوب تہذیب سے بھی سیکھتی ہے۔ کبھی مغلوب تہذیب، غالب تہذیب سے سیکھ کر اپنے آپ کو ترقی کی راہ کی طرف گامزن کرتی ہے۔

اس لیے یہ بات بالکل عام فہم ہے کہ ایک عروج و کمال پر موجود تہذیب علم و تحقیق کے آفاقی اصولوں کو اپنائے گی۔ اور مغلوب قوم اپنی قوم کو ترقی اور عروج کے لیے غالب قوم کے علم سے استفادہ کرے گی۔ اور اس کی علمی تعبیر پر ہی اپنے علم کی بنیاد رکھے گی۔ ہاں مگر وہ اپنی تہذیب کے اصولوں کے مطابق اس کا ایک تنقیدی جائزہ لے گی اور وہ علم ونظریات جو اسے اپنی تہذیب کے اصولوں کے خلاف لگیں گے وہ ان کی کانٹ چھانٹ کرے گی۔

مگر یہ بات بعید از عقل ہے کہ وہ مغلوب تہذیب اپنے علم اور اپنی ہی تحقیق کی بنیاد پر غالب تہذیب سے استفادہ کیے بغیر ہی ترقی کی منازل طے کر لے۔ اس لیے کہ ایک لمبا عرصہ غالب تہذیب اپنے علم و تحقیق کی بنیاد پر ترقی کی منازل طے کرتی رہی۔ اور

مغلوب تہذیب خواب غفلت میں مشغول رہی۔ تو اب وہ علم کی کوئی نئی بنیاد نہیں بنا سکتی۔ اگر وہ کوئی بنیاد بنائے گی تو وہ غالب قوم کے علم و تحقیق کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ بلکہ اس سے کمتر ہی نظر آئے گی۔مگر اس کے برعکس اگر وہ کھلے د ل سے غالب قوم کی علمی ترقی کو تسلیم کر لیتی ہے۔ اور اس سے استفادہ کرتی ہے تو بہت جلد ہی وہ ترقی کی منازل طے کر کے نا صرف اس غالب تہذیب کے برابر آجائے گی بلکہ ممکن ہے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ ترقی کی منازل طے کر کے اس غالب تہذیب کوکہیں پیچھے چھوڑ دے۔

اس لیے سر سید احمد خان کی فکر کے مطابق اگر عوام معاشی کامیابی حاصل کر بھی لیتی تو یقیناً وہ اپنا تشخص، اپنی شناخت سب کھو دیتی اور انگریز قوم میں ضم ہو جاتی۔ اور اسی طرح اگر عوام دارالعلوم دیوبند کے نقطہ نظر کے مطابق انگریزی سے بالکل بائیکاٹ کر لیتی تو وہ ایک خول میں خود کو بند کر لیتی اور مغربی علوم سیکھ کر کبھی دوسرے ملکوں کے برابر آکر نہ کھڑی ہوتی۔ علامہ محمد اقبال جو کہ خود ایک مکتبہ فکر کے نمائندہ ہیں۔ اور اس مکتبہ فکر کے مطابق اپنی خودی کو برقرار رکھتے ہوئے مغربی علوم سے استفادہ کیا جائے۔ اور ترقی اور معاشی خوشحالی سے دنیا میں اپنا ایک مقام بنایا جائے۔ اور مسلم قوم کو غربت اور جہالت سے نکالا جائے۔ تو مسلم عوام نہ صرف یہ کہ اپنا تشخص برقرار رکھے گی بلکہ وہ انگریز قوم میں ضم ہونے سے بھی محفوظ رہی اس لحاظ سے خودعلامہ اقبال کی فکر تہذیب وثقافت کے بارے میں تجرباتی اور نظریاتی لحاظ سے مؤثر رہی۔

علامہ محمد اقبال کو سابقہ دونوں مکتبہ فکر پر ترجیح دینے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب کی ترقی کی وجہ سے جہاں اس کے اصول اپنانے کی نصیحت کرتے ہیں جن کی وجہ سے اس نے دنیا میں اپنا ایک مقام بنایا ہے وہیں پر وہ مغربی تہذیب کی مثبت باتوں کوتسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ منفی باتوں کو رد کرتے ہیں۔ اور یہ کہ اقبال نے اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ کس طرح مغربی تہذیب، علمی سطح پر کی ذہن سازی کر کے مسلمانوں کو ان کی تہذیب وثقافت سے دور کرنے کی سازش کر رہی ہے۔ اور اس لحاظ سے علامہ اقبال مغربی تہذیب کے سامنے اپنی تہذیب کا دفاع کرنے کی بجائے ان کی تہذیب پر ایک پر مغز

تنقید بھی کرتے ہیں۔ اور ان کی تہذیب میں موجود خامیوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔

چونکہ تمام تہذیبوں کی بنیاد کسی نہ کسی مذہب پر ہے خواہ وہ کوئی تہذیب ہو۔ اس لیے کسی تہذیب پر حملہ دراصل اس کے مذہب پر حملہ ہو گا۔ جبکہ مذہب اسلام جب کسی تہذیب پر وارد ہوتا ہے تو وہ اس کی تہذیب کو نہیں بدلتا اور اس کو مٹانے یا نیست و نابود کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اس میں انتہائی ضروری تبدیلیاں کرتا ہے۔ اور باقی تہذیب کو قائم ودائم رکھتا ہے مگر جب کوئی اور تہذیب اسلامی تہذیب پر حملہ آور ہوتی ہے تو اس میں بنیادی تبدیلیاں کردیتی ہے۔ اوروہ اصول جس پر دین اسلام قائم ہے۔ ان اصولوں کو اس تہذیب کا حصہ بنا دیتی ہے کسی بھی تہذیب کا اسلامی تہذیب پر حملہ دراصل دین اسلام کے بنیادی اصولوں پر حملہ ہے۔ اس لحاظ سے علامہ اقبال اسلامی تہذیب کے بارے میں یقین رکھتے ہیں کہ اسلام ایک آفاقی دین ہے اور اس سے بننے والی تہذیب بھی ایک آفاقی تہذیب ہے۔

ان کے نزدیک اسلامی تہذیب صرف زندگی کے رواج اور رسوم و عبادت کا نام نہیں بلکہ ایک کشمکش کا نام ہے۔ یعنی جمود نہیں بلکہ ایک متحرک وجود کا نام ہے۔ اس لحاظ سے علامہ اقبال جامد مذہبی تصور کے پیروکار نہ بنے جیسا کہ ہمارے ہاں دارالعلوم دیوبند کے مکتبہ فکر کا رویہ ہمارے سامنے تھا۔ اور نہ ہی جدت کے علمبردار بنے جیسا کہ سرسید احمد خان کے مکتبہ فکر کی سوچ تھی۔ ان دونوں مکتبہ فکر میں سے ایک کی سوچ انکی تہذ یب و ثقافت اور مذہبی روایات کو بچانے کی تھی اور دوسرے طبقے کے پیش نظر معاشی ترقی کی طرف لے کر جاناتھا۔اور اس میں ان کے پر خلوص جذبات نمایاں ہیں۔ اور ان کی اس نیک نیتی پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ ہر کوئی اپنی سوچ سمجھ کے مطابق کوشش کرتا مسائل کو حل کرنے کے لیے مگر بعض دفعہ مسائل کے کئی حل موجود ہوتے ہوئے ان میں سے صرف وہی کارگر رہتے ہیں۔ جو دیر پا اور مؤثر ہوں۔ اور عوام کی بھلائی اور مفاد میں ہوں اور جس سے عوام اپنی عزت نفس، اپنی شناخت بھی قائم رکھ سکتے ہوں۔

آج پاکستان قائم ودائم ہے۔ اور علامہ اقبال کی وسیع النظری کے مطابق ایک خطہ جہاں مسلمان آزاد ہیں اپنی تہذیب وثقافت اور دینی روایات کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اور

اس خطے کی تہذیب جو بھی خطرات درپیش ہیں ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اپنی دینی روایات کو برقرار رکھ کر ا س کا پرچار کر سکتے ہیں۔ اورستر برس گزر گئے ہیں اور علامہ اقبال کے نظریہ کے مطابق عوام نے نہ تو دارالعلوم دیوبندکی فکر کے مطابق انگریزی تعلیم کو قطعاً نظر انداز کیا اور نہ ہی علی گڑھ کے مطابق مغربی تہذیب کے رنگ میں ہی رنگے گئے۔ بلکہ علامہ اقبال کی اعتدال کی راہ کو عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی۔

مغربی تہذیب آج بھی یہ سمجھتی ہے کہ اس کی تہذیب ترقی یافتہ ہونے کی وجہ آج بھی ایک بین الاقوامی تہذیب بننے کا درجہ رکھتی ہے۔ ترقی اور خوشحالی اور طاقت ور ہونے کی وجہ سے وہ چاہتی ہے کہ اسے دنیا بھر میں پھیلایا جائے۔ مگر اس تہذیب میں موجود خامیاں اس کی بین الاقوامی تہذیب بننے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ مگر مغربی تہذیب کے علمبردار اسے پوری دنیا میں پھیلانے پر مصرہیں۔ آنے والے دورمیں یہی تہذیبی تصادم عالمی امن کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ اور جنگ عظیم کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی تہذیب مغرب کی اقتصادی، سیاسی اور فوجی بالادستی کو للکار سکتی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے اپنی اسلامی تہذیب کی حفاظت فرض اول ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے دین اسلام کو بھی دنیا کی دست درازی سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ قاضی جاوید، *سرسید سے اقبال تک*، لاہور، گلشن ہاؤس ۱۸۔منزنگ روڈ، اشاعت سوم، ۲۰۱۰ء، ص۱۰۔

۲۔ کنیز فاطمہ یوسف، *اقبال اور عصری مسائل*، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، اشاعت ۲۰۰۵ء، ص۲،۷۲،۱۵۷

۳۔ ابن خلدون،عبدالرحمٰن، *مقدمہ ابن خلدون*، مترجم، راغب رحمانی، کراچی، نفیس اکیڈمی اردو بازار، اشاعت گیارہ، ص۱۰

۴۔ طارق جان، *سیکولرازم مباحث اور مغالط*، مترجم محبّ الحق صاحبزادہ، لاہور، منشورات، ص ی۴۴۵

۵۔ ایضا، ص۴۳۳

۶۔ کنیز فاطمہ یوسف، *اقبال اور عصری مسائل*، ،ص۳۲۸۔

۷۔ کنیز فاطمہ یوسف، *اقبال اور عصری مسائل*، ص۱۰۹۔

۸۔ مودودی، ابوالاعلی، *اسلامی تہذیب وتمدن کے اصول*، لاہور، سلامک پبلیکیشنز ،[پرائیویٹ لیمیٹڈ] ۱۳ ای، شاہ عالم مارکیٹ، ص۷۔

۹۔ ایضا ،ص۱۰،۱۱۔

۱۰۔ ندوی، ابوالحسن علی، *اسلامی تہذیب و ثقافت*، اسلام آباد، دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ص۳۹۔

۱۱۔ کنیز فاطمہ یوسف، *اقبال اور عصری مسائل* ،ص۱۱۱۔

۱۲۔ معید الظفر ،*تہذیبی تصادم اور فکر اقبال*، سرینگر، انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، ص۱۰۵۔

۱۳۔ قاضی جاوید، *سرسید سے اقبال تک*، ص۱۷۔

۱۴۔ ایضا،ص۱۲، ۱۴۔

۱۵۔ ایضا،ص۱۵۔

۱۶۔ ایضا،ص۳۱۔

۱۷۔ ایضا،ص۱۴۵،۱۴۶۔

۱۸۔ ایضا،ص۱۱۸۔

۱۹۔ ایضا،ص ۱۲۰۔

۲۰۔ ص،۱۵۹۔

۲۱۔ کنیز فاطمہ یوسف، *اقبال اور عصری مسائل* ،ص۳۵۔

۲۲۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہوردانش گاہ پنجاب، ج۳، ص۱۳۔

۲۳۔ قاضی جاوید، *سرسید سے اقبال تک* ،ص/۲۱۶۔

۲۴۔ علامہ اقبال،*تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ*، مع مقدمہ،حواشی اور تصریحات از سید نذیر نیازی، نئی دہلی، اسلامک بک سنٹر،

۲۵۔ علامہ محمد اقبال،*علم الاقتصاد*، لاہور ،سنگ میل پبلی کیشنز ،ص۱۸۵۔

26. Allama Muhammad Iqbal, The Reconstructions of Religious Thought in Islam, Edited by M.Saeed Sheikh, Lahore, 1996, pp. 122-123

۲۷۔ ایوب صابر،*تصور پاکستان [علامہ اقبال پر اعتراضات کا جائزہ]* اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ص۷۰

۲۸۔ فتح محمد ملک، *اقبال کے سیاسی تصورات*، لاہور، دوست پبلی کیشنز، ص۲۲،۱۵۶۔

۲۹۔ معید الظفر ،*تہذیبی تصادم اور فکر اقبال*، ص۱۰۵۔

۳۰۔ معید الظفر ،*تہذیبی تصادم اور فکر اقبال*،ص۱۱۲۔

۳۱۔ ایوب صابر،*تصور پاکستان [علامہ اقبال پر اعتراضات کا جائزہ]*،ص۳۷۔

۳۲۔ فتح محمد ملک، *اقبال فراموشی*، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص۳۴۔

۳۳۔ وحید قریشی، *علامہ اقبال کا تصور ریاست*، لاہور، بزم اقبال، ۲کلب روڈ،ص۱۳۔

۳۴۔ سید قطب شہید، *المعالم فی الطریق*، مترجم، خلیل احمد حامدی، لاہور، اسلامک پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، منصورہ ملتان روڈ ،ص۱۸۷۔

۳۵۔ مصدق محمود گھمن، *امت اور ریاست*، اسلام آباد، انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ سٹڈیز اینڈ ریسرچ، ص۲۴۶۔

۳۶۔ مرزا محمد الیاس، *جمہوریت اور اسلام [مغرب کا مقدمہ] کراچی*، اسلامک ریسرچ، ادارہ معارف اسلامی، ص ص۳۱، ۷۱ ۳۷

۳۷۔ مودودی، ابوالاعلیٰ ،مولانا،*تحریک آزادی ہند اور مسلمان* [حصہ اول] لاہور، اسلامک پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، منصورہ ملتان روڈ، ص۱۹۸۔